

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
 سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
 سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اس کی
 سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
 سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
 یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے رات اسے چاند نکتا رہتا ہے
 ستارے بام فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
 سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
 سنا ہے اس کو برن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
 سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
 سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
 سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اُنہ تمثال ہے جبین اس کی
 جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے جب سے حمانل ہیں اس کی گردن میں
 مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے چشم تصور سے دشت امکان میں
 پلنگ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
 کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
 وہ سرو قد ہے مگر ہے گل مراد نہیں
 کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں
 بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
 سو ربروان تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اس کے شبستان سے متصل ہے بہشت
 مکیں ادھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں
 رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
 چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
 کسے نصیب کہ ہے پیر بن اسے دیکھے
 کبھی کبھی در و دیوار گہر کے دیکھتے ہیں
 کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
 اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں
 اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
 فرارِ او ستارے سفر کے دیکھتے ہیں
 رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
 آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
 کچھ تو مرے پندار محبت کا بہرم رکھ
 تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ
 پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
 رسم و رہ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
 تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے ا
 اک عمر سے ہوں لذت گریہ سے بھی محروم
 اے راحت جاں مجھ کو رلانے کے لیے ا
 اب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
 یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے ا
 اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
 جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
 ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
 یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں
 غم دنیا بھی غم یار میں شامل کر لو
 نشہ بڑھتا ہے شرابیوں جو شرابوں میں ملیں
 تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
 دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں
 آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
 کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں
 اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
 جیسے دو شخص تمنا کے سراپوں میں ملیں
 اس سے پہلے کہ ہے وفا ہو جائیں
 کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں
 تو بھی بیرے سے بن گیا پتھر
 ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں
 تو کہ یکتا تھا ہے شمار ہوا
 ہم بھی ٹوٹیں تو جا بجا ہو جائیں
 ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
 پھر کہیں اور مبتلا ہو جائیں
 ہم اگر منزلیں نہ بن پائے
 منزلوں تک کا راستا ہو جائیں
 دیر سے سوچ میں ہیں پروانے
 راکھ ہو جائیں یا ہوا ہو جائیں
 عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
 خاک ہو جائیں کیمیا ہو جائیں
 اب کے گر تو ملے تو ہم تجھ سے
 ایسے لپٹیں تری قبا ہو جائیں
 بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
 کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں
 آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا
 وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا
 اتنا مانوس نہ ہو خلوت غم سے اپنی
 تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا
 ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
 میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا
 زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
 تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا
 ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
 ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا
 زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
 تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے
 تو محبت سے کوئی چال تو چل
 بار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

دل دھڑکتا نہیں ٹپکتا ہے
 کل جو خواہش تھی ابلہ ہے مجھے
 ہم سفر چاہیئے بحوم نہیں
 اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے
 کوہ کن ہو کہ قیس ہو کہ فراز
 سب میں اک شخص ہی ملا ہے مجھے
 ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
 فراز اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں
 جدائیاں تو مقدر ہیں پھر بھی جان سفر
 کچھ اور دور ذرا ساتھ چل کے دیکھتے ہیں
 رہ وفا میں حریف خرام کوئی تو ہو
 سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں
 تو سامنے ہے تو پھر کیوں یقین نہیں آتا
 یہ بار بار جو آنکھوں کو مل کے دیکھتے ہیں
 یہ کون لوگ ہیں موجود تیری محفل میں
 جو لالچوں سے تجھے مجھ کو جل کے دیکھتے ہیں
 یہ قرب کیا ہے کہ یک جا ہوئے نہ دور رہے
 بزار ایک ہی قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں
 نہ تجھ کو مات ہوئی ہے نہ مجھ کو مات ہوئی
 سو اب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں
 یہ کون ہے سر ساحل کہ ڈوبنے والے
 سمندروں کی تہوں سے اچھل کے دیکھتے ہیں
 ابھی تلک تو نہ کنڈن ہوئے نہ راکھ ہوئے
 ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں
 بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خبر
 چلو فراز کو اے یار چل کے دیکھتے ہیں
 سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
 ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
 شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
 اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے
 کتنا آساں تھا ترے بحر میں مرنا جاناں
 پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے
 جشن مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
 پا بجولاں ہی سبھی ناچتے گاتے جاتے
 اس کی وہ جانے اسے پاس وفا تھا کہ نہ تھا
 تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے
 دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
 وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا
 اب اسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
 سخت نادم ہے مجھے دلم میں لانے والا
 صبح دم چھوڑ گیا نکمت گل کی صورت
 رات کو غنچہ دل میں سمٹ آنے والا
 کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
 وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا
 تیرے بوتے ہوئے آ جاتی تھی ساری دنیا
 آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا
 منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
 کون آنے گا یہاں کون ہے آنے والا
 کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھلا ہے اتنا
 ہے وہی مجھ کو سر دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
 بے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا
 تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
 دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا
 قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
 وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا
 آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
 اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا
 وہ راحت جاں ہے مگر اس در بدری میں
 ایسا ہے کہ اب دھیان ادھر بھی نہیں جاتا
 ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
 پاؤں بھی ہیں شل شوق سفر بھی نہیں جاتا
 دل کو تری چاہت پہ بھروسہ بھی بہت ہے
 اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا
 پاگل ہوئے جاتے ہو فراز اس سے ملے کیا
 اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا
 عاشقی میں میر جیسے خواب مت دیکھا کرو
 باؤلے ہو جاؤ گے مہتاب مت دیکھا کرو
 جستہ جستہ پڑھ لیا کرنا مضامین وفا
 پر کتاب عشق کا ہر باب مت دیکھا کرو
 اس تماشے میں الٹ جاتی ہیں اکثر کشتیاں
 ڈوبنے والوں کو زیر آب مت دیکھا کرو
 مے کدے میں کیا تکلف مے کشی میں کیا حجاب
 بزم ساقی میں ادب آداب مت دیکھا کرو
 ہم سے درویشوں کے گھر آؤ تو یاروں کی طرح
 ہر جگہ خس خانہ و برقاب مت دیکھا کرو
 مانگے تانگے کی قبائیں دیر تک رہتی نہیں
 یار لوگوں کے لقب القاب مت دیکھا کرو
 تشنگی میں لب بھگو لینا بھی کافی ہے فراز
 جام میں صہبا ہے یا زہراب مت دیکھا کرو
 اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
 اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا
 ڈھلتی نہ تھی کسی بھی جتن سے شب فراق
 اے مرگ ناگہاں ترا آنا بہت ہوا
 ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا
 اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا
 اب ہم ہیں اور سارے زمانے کی دشمنی
 اس سے ذرا سا ربط بڑھانا بہت ہوا
 اب کیوں نہ زندگی پہ محبت کو وار دیں
 اس عاشقی میں جان سے جانا بہت ہوا
 اب تک تو دل کا دل سے تعارف نہ ہو سکا
 مانا کہ اس سے ملنا ملنا بہت ہوا
 کیا کیا نہ ہم خراب ہوئے ہیں مگر یہ دل
 لے یاد یار تیرا ٹھکانہ بہت ہوا
 کہتا تھا ناصحوں سے مرے منہ نہ آئیو
 پھر کیا تھا ایک بو کا بہانہ بہت ہوا
 لو پھر ترے لبوں پہ اسی بے وفا کا ذکر
 احمد فراز تجھ سے کہا نا بہت ہوا
 اب کے تجدید وفا کا نہیں امکان جاناں
 یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیمان جاناں

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسانِ جاناں
زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں
دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہے فسرده تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں
اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر
ہے پیسے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں
آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگ مینا سلگ اٹھی کہ رگ جاں جاناں
مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ امید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں
ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غم دوراں سے جدا ہے غم جاناں جاناں
اب کے کچھ ایسی سچی محفل یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بہ گریباں جاناں
ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سانے سے ہراساں جاناں
جس کو دیکھو وہی زنجیر بہ پا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں
اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنوان جاناں
ہم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ بھراں جاناں
ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اڑتے ہوئے اوراقِ پریشاں جاناں
ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کس کو سیراب کرے وہ کسے پیاسا رکھے
عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
اے مری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے
ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے
دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے
کم نہیں طمعِ عبادت بھی تو حرصِ زر سے
فقر تو وہ ہے کہ جو دین نہ دنیا رکھے
بنس نہ اتنا بھی فقیروں کے اکیلے پن پر
جا خدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے
یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے
اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم
صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا
سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم
اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم
تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لٹائیں ہم
وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فراز
ہے بے خدا نہ کردہ تجھے بھی رلائیں ہم

اس نے سکوت شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
 بجر کی رات بام پر ماہ تمام رکھ دیا
 آمد دوست کی نوید کوئے وفا میں عام تھی
 میں نے بھی اک چراغ سا دل سر شام رکھ دیا
 شدت تشنگی میں بھی غیرت مے کشی رہی
 اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا
 اس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
 میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا
 دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
 میں نے تو سب حساب جاں بر سر عام رکھ دیا
 اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
 کپک دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا
 جو بھی ملا اسی کا دل حلقہ بگوش یار تھا
 اس نے تو سارے شہر کو کر کے غلام رکھ دیا
 اور فراز چابٹیں کتنی محبتیں تجھے
 ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا
 دکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
 دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
 آج تک اپنی بیکلی کا سبب
 خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
 بے طرح حال دل ہے اور تجھ سے
 دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
 ایک تو حرف آشنا تھا مگر
 اب زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
 قاصدا ہم فقیر لوگوں کا
 اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
 اے خدا درد دل ہے بخشش دوست
 آب و دانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
 اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز
 آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں
 جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
 اے جان جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو
 یہ خواب ہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
 یہ دھند ہے بادل ہے کہ سایا ہے کہ تم ہو
 اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
 میں ہوں کہ کوئی اور ہے دنیا ہے کہ تم ہو
 دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
 دیکھوں یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو
 یہ عمر گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
 ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو
 ہر بزم میں موضوع سخن دل زدگاں کا
 اب کون ہے شیریں ہے کہ لیلیٰ ہے کہ تم ہو
 اک درد کا پھیلا ہوا صحرا ہے کہ میں ہوں
 اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو
 وہ وقت نہ آئے کہ دل زار بھی سوچے
 اس شہر میں تنہا کوئی ہم سا ہے کہ تم ہو
 آباد ہم آشفتمہ سروں سے نہیں مقتل
 یہ رسم ابھی شہر میں زندہ ہے کہ تم ہو
 اے جان فراز اتنی بھی توفیق کسے تھی
 ہم کو غم بستی بھی گوارا ہے کہ تم ہو

سامنے اس کے کبھی اس کی ستائش نہیں کی
 دل نے چاہا بھی اگر ہونٹوں نے جنبش نہیں کی
 اہل محفل پہ کب احوال کھلا ہے اپنا
 میں بھی خاموش رہا اس نے بھی پرسش نہیں کی
 جس قدر اس سے تعلق تھا چلا جاتا ہے
 اس کا کیا رنج ہو جس کی کبھی خواہش نہیں کی
 یہ بھی کیا کم ہے کہ دونوں کا بھرم قائم ہے
 اس نے بخشش نہیں کی ہم نے گزارش نہیں کی
 اک تو ہم کو ادب آداب نے پیاسا رکھا
 اس پہ محفل میں صراحتی نے بھی گردش نہیں کی
 ہم کہ دکھ اوڑھ کے خلوت میں پڑے رہتے ہیں
 ہم نے بازار میں زخموں کی نمائش نہیں کی
 اے مرے ابر کرم دیکھ یہ ویرانہ جاں
 کیا کسی دشت پہ تو نے کبھی بارش نہیں کی
 کٹ مرے اپنے قبیلے کی حفاظت کے لیے
 مقتل شہر میں ٹھہرے رہے جنبش نہیں کی
 وہ ہمیں بھول گیا ہو تو عجب کیا ہے فراز
 ہم نے بھی میل ملاقات کی کوشش نہیں کی
 گفتگو اچھی لگی ذوق نظر اچھا لگا
 مدتوں کے بعد کوئی ہم سفر اچھا لگا
 دل کا دکھ جانا تو دل کا مسئلہ ہے پر ہمیں
 اس کا بنس دینا ہمارے حال پر اچھا لگا
 ہر طرح کی ہے سر و سامانیوں کے باوجود
 آج وہ آیا تو مجھ کو اپنا گھر اچھا لگا
 باغبان گلچیں کو چاہے جو کہے ہم کو تو پھول
 شاخ سے بڑھ کر کف دل دار پر اچھا لگا
 کوئی مقتل میں نہ پہنچا کون ظالم تھا جسے
 تیغ قاتل سے زیادہ اپنا سر اچھا لگا
 ہم بھی قاتل ہیں وفا میں استواری کے مگر
 کوئی پوچھے کون کس کو عمر بھر اچھا لگا
 اپنی اپنی چابتیں ہیں لوگ اب جو بھی کہیں
 اک پری پیکر کو اک آشفتمہ سر اچھا لگا
 میر کے مانند اکثر زیست کرتا تھا فراز
 تھا تو وہ دیوانہ سا شاعر مگر اچھا لگا
 کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
 غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے
 وہ خار خار ہے شاخ گلاب کی مانند
 میں زخم زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے
 یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
 میں کیسے بات کروں اب کہاں سے لاؤں اسے
 مگر وہ زود فراموش زود رنج بھی ہے
 کہ روٹھ جائے اگر یاد کچھ دلاؤں اسے
 وہی جو دولت دل ہے وہی جو راحت جاں
 تمہاری بات پہ اے ناصحو گناؤں اسے
 جو ہم سفر سر منزل بچھڑ رہا ہے فراز
 عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اسے
 روگ ایسے بھی غم یار سے لگ جاتے ہیں
 در سے اٹھتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں
 عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
 بعد میں سیکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں

پہلے پہلے بوس اک آدھ دکان کھولتی ہے
 پھر تو بازار کے بازار سے لگ جاتے ہیں
 بے بسی بھی کبھی قربت کا سبب بنتی ہے
 رو نہ پائیں تو گلے یار سے لگ جاتے ہیں
 کترین غم کی جو گلیوں میں اڑی پھرتی ہیں
 گھر میں لے آؤ تو انبار سے لگ جاتے ہیں
 داغ دامن کے بوں دل کے بوں کہ چہرے کے فراز
 کچھ نشان عمر کی رفتار سے لگ جاتے ہیں
 تیری باتیں ہی سنانے آئے
 دوست بھی دل ہی دکھانے آئے
 پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
 تیرے آنے کے زمانے آئے
 ایسی کچھ چپ سی لگی ہے جیسے
 ہم تجھے حال سنانے آئے
 عشق تنہا ہے سر منزل غم
 کون یہ بوجھ اٹھانے آئے
 اجنبی دوست ہمیں دیکھ کہ ہم
 کچھ تجھے یاد دلانے آئے
 دل دھڑکتا ہے سفر کے ہنگام
 کاش پھر کوئی بلانے آئے
 اب تو رونے سے بھی دل دکھتا ہے
 شاید اب بوش ٹھکانے آئے
 کیا کہیں پھر کوئی بستی اجڑی
 لوگ کیوں جشن منانے آئے
 سو رہو موت کے پہلو میں فراز
 نیند کس وقت نہ جانے آئے
 ایسا ہے کہ سب خواب مسلسل نہیں بوتے
 جو آج تو بوتے ہیں مگر کل نہیں بوتے
 اندر کی فضاؤں کے کرشمے بھی عجب ہیں
 مینہ ٹوٹ کے برسے بھی تو بادل نہیں بوتے
 کچھ مشکلیں ایسی ہیں کہ آساں نہیں بوتیں
 کچھ ایسے معمے ہیں کبھی حل نہیں بوتے
 شائستگی غم کے سبب آنکھوں کے صحرا
 نمناک تو ہو جاتے ہیں جل تھل نہیں بوتے
 کیسے ہی تلاطم ہوں مگر قلزم جاں میں
 کچھ یاد جزیرے ہیں کہ اوجھل نہیں بوتے
 عشاق کے مانند کئی اہل بوس بھی
 پاگل تو نظر آتے ہیں پاگل نہیں بوتے
 سب خوابشیں پوری ہوں فراز ایسا نہیں ہے
 جیسے کئی اشعار مکمل نہیں بوتے
 قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
 دل وہ ہے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
 ہم نہ بوتے تو کسی اور کے چرچے بوتے
 خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
 یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
 اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے
 اپنا یہ حال کہ جی بار چکے لٹ بھی چکے
 اور محبت وہی انداز پرانے مانگے
 زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
 اور تو ہے کہ سدا اُٹینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جان فراز
 مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے
 اگرچہ زور ہواؤں نے ڈال رکھا ہے
 مگر چراغ نے لو کو سنبھال رکھا ہے
 محبتوں میں تو ملنا ہے یا اجڑ جانا
 مزاج عشق میں کب اعتدال رکھا ہے
 ہوا میں نشہ ہی نشہ فضا میں رنگ ہی رنگ
 یہ کس نے پیریں اپنا اچھال رکھا ہے
 بھلے دنوں کا بھروسا ہی کیا رہیں نہ رہیں
 سو میں نے رشتہ غم کو بحال رکھا ہے
 ہم ایسے سادہ دلوں کو وہ دوست ہو کہ خدا
 سبھی نے وعدہ فردا پہ ٹال رکھا ہے
 حساب لطف حریفان کیا ہے جب تو کھلا
 کم دوستوں نے زیادہ خیال رکھا ہے
 بھری بہار میں اک شاخ پر کھلا ہے گلاب
 کہ جیسے تو نے ہتھیلی پہ گال رکھا ہے
 فراز عشق کی دنیا تو خوبصورت تھی
 یہ کس نے فتنہ بجر و وصال رکھا ہے
 شعلہ تھا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو
 میں کب کا جا چکا ہوں صدائیں مجھے نہ دو
 جو زبر پی چکا ہوں تمہیں نے مجھے دیا
 اب تم تو زندگی کی دعائیں مجھے نہ دو
 یہ بھی بڑا کرم ہے سلامت ہے جسم ابھی
 اے خسروان شہر قبائیں مجھے نہ دو
 ایسا نہ ہو کبھی کہ پلٹ کر نہ آ سکوں
 ہر بار دور جا کے صدائیں مجھے نہ دو
 کب مجھ کو اعتراف محبت نہ تھا فراز
 کب میں نے یہ کہا ہے سزائیں مجھے نہ دو
 کٹھن ہے راہ گزر تھوڑی دور ساتھ چلو
 بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دور ساتھ چلو
 تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
 یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ چلو
 نشے میں چور ہوں میں بھی تمہیں بھی ہوش نہیں
 بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دور ساتھ چلو
 یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
 کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دور ساتھ چلو
 ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغ راہوں کے
 ابھی ہے دور سحر تھوڑی دور ساتھ چلو
 طواف منزل جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
 فراز تم بھی اگر تھوڑی دور ساتھ چلو
 پھر اسی رہ گزار پر شاید
 ہم کبھی مل سکیں مگر شاید
 جن کے ہم منتظر رہے ان کو
 مل گئے اور ہم سفر شاید
 جان پہچان سے بھی کیا ہوگا
 پھر بھی اے دوست غور کر شاید
 اجنبیت کی دھند چھٹ جائے
 چمک اٹھے تری نظر شاید
 زندگی بھر لہو رلائے گی
 یاد یاران ہے خبر شاید

جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز
 پھر بھی تو انتظار کر شاید
 خاموش ہو کیوں داد جفا کیوں نہیں دیتے
 بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے
 وحشت کا سبب روزن زنداں تو نہیں ہے
 مہر و مہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے
 اک یہ بھی تو انداز علاج غم جاں ہے
 اے چارہ گرو درد بڑھا کیوں نہیں دیتے
 منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
 مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے
 ریزن ہو تو حاضر ہے متاع دل و جاں بھی
 رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے
 کیا بیت گئی اب کے فراز اہل چمن پر؟
 یاران قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے
 اول اول کی دوستی ہے ابھی
 اک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی
 میں بھی شہر وفا میں نو وارد
 وہ بھی رک رک کے چل رہی ہے ابھی
 میں بھی ایسا کہاں کا زود شناس
 وہ بھی لگتا ہے سوچتی ہے ابھی
 دل کی وارفتگی ہے اپنی جگہ
 پھر بھی کچھ احتیاط سی ہے ابھی
 گرچہ پہلا سا اجتناب نہیں
 پھر بھی کم کم سپردگی ہے ابھی
 کیسا موسم ہے کچھ نہیں کھلتا
 بوندا باندی بھی دھوپ بھی ہے ابھی
 خود کلامی میں کب یہ نشہ تھا
 جس طرح روبرو کوئی ہے ابھی
 قربتیں لاکھ خوبصورت ہوں
 دوریوں میں بھی دل کشی ہے ابھی
 فصل گل میں بہار پہلا گلاب
 کس کی زلفوں میں ٹانکتی ہے ابھی
 مدتیں ہو گئیں فراز مگر
 وہ جو دیوانگی کہ تھی ہے ابھی
 ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
 تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے
 اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
 راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے
 کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے
 یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے
 تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
 یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے
 منزلیں دور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
 اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے
 آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فراز
 چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے
 جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
 تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے
 تو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسس ہے کار
 برگ اوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لو تھی کہ وہ تو تھا مگر بجر کی رات
 دیر تک روتا رہا کوئی سربانے میرے
 خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
 لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں فسانے میرے
 لٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
 دیکھ غارت گر دل یہ بھی خزانے میرے
 آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
 جس کے بوتے ہوئے بوتے تھے زمانے میرے
 کاش تو بھی میری آواز کہیں سنتا ہو
 پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے
 کاش تو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
 لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے
 کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
 بات سن لی ہے مری آج خدا نے میرے
 تو بے کس حال میں اے زود فراموش مرے
 مجھ کو تو چھین لیا عہد وفا نے میرے
 چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جان فراز
 جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے
 تجھ سے مل کر تو یہ لگتا ہے کہ اے اجنبی دوست
 تو مری پہلی محبت تھی مری آخری دوست
 لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
 یہ تو دنیا ہے مری جاں کئی دشمن کئی دوست
 تیرے قامت سے بھی لپٹی ہے امر بیل کوئی
 میری چابت کو بھی دنیا کی نظر کھا گئی دوست
 یاد آئی ہے تو پھر ٹوٹ کے یاد آئی ہے
 کوئی گزری ہوئی منزل کوئی بھولی ہوئی دوست
 اب بھی آئے ہو تو احسان تمہارا لیکن
 وہ قیامت جو گزرنی تھی گزر بھی گئی دوست
 تیرے لہجے کی تھکن میں ترا دل شامل ہے
 ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آ گئی دوست
 بارش سنگ کا موسم ہے مرے شہر میں تو
 تو یہ شیشے سا بدن لے کے کہاں آ گئی دوست
 میں اسے عہد شکن کیسے سمجھ لوں جس نے
 آخری خط میں یہ لکھا تھا فقط آپ کی دوست
 یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
 فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی
 یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
 شمار ابھی سے جدائی کی ساعتیں کرنی
 کوئی خدا ہو کہ پتھر جسے بھی ہم چاہیں
 تمام عمر اسی کی عبادتیں کرنی
 سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
 کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی
 ہم اپنے دل سے ہی مجبور اور لوگوں کو
 ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی
 ملیں جب ان سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
 پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی
 یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباتے ہیں
 ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی
 کبھی فراز نئے موسموں میں رو دینا
 کبھی تلاش پرانی رفاقتیں کرنی

ساقیا ایک نظر جام سے پہلے پہلے
 ہم کو جانا ہے کہیں شام سے پہلے پہلے
 نو گرفتار وفا سعتِ ربانی ہے عبث
 ہم بھی الجھے تھے بہت دام سے پہلے پہلے
 خوش ہو اے دل کہ محبت تو نبھا دی تو نے
 لوگ اجڑ جاتے ہیں انجام سے پہلے پہلے
 اب ترے ذکر پہ ہم بات بدل دیتے ہیں
 کتنی رغبت تھی ترے نام سے پہلے پہلے
 سامنے عمر پڑی ہے شب تنہائی کی
 وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے
 کتنا اچھا تھا کہ ہم بھی جیا کرتے تھے فراز
 غیر معروف سے گمنام سے پہلے پہلے
 بونی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
 کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تو
 مری مثال کہ اک نخل خشک صحرا ہوں
 ترا خیال کہ شاخ چمن کا طائر تو
 میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
 میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تو
 ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
 یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تو
 فضا اداس ہے رت مضحل ہے میں چپ ہوں
 جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تو
 فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
 زمانہ صاحب زر اور صرف شاعر تو
 تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
 میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہوں
 مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
 میں سنگ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں
 تو آ چکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
 ہے درد میں ابھی انہیں گہرائیوں میں ہوں
 اے یار خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
 کب سے اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں
 تو لوٹ کر بھی اہل تمنا کو خوش نہیں
 یاں لٹ کے بھی وفا کے انہی قافلوں میں ہوں
 بدلا نہ میرے بعد بھی موضوع گفتگو
 میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں
 مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
 یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خوابشوں میں ہوں
 تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
 اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں
 خود ہی مثال لالہ صحرا لہو لہو
 اور خود فراز اپنے تماشائیوں میں ہوں
 تجھے ہے مشق ستم کا ملال ویسے ہی
 ہماری جان تھی جاں پر وبال ویسے ہی
 چلا تھا ذکر زمانے کی ہے وفائی کا
 سو آ گیا ہے تمہارا خیال ویسے ہی
 ہم آ گئے ہیں تم دام تو نصیب اپنا
 وگرنہ اس نے تو پھینکا تھا جال ویسے ہی
 میں روکنا ہی نہیں چاہتا تھا وار اس کا
 گری نہیں مرے ہاتھوں سے ڈھال ویسے ہی

زمانہ ہم سے بھلا دشمنی تو کیا رکھتا
 سو کر گیا ہے ہمیں پائمال ویسے ہی
 مجھے بھی شوق نہ تھا داستاں سنائے کا
 فراز اس نے بھی پوچھا تھا حال ویسے ہی
 اب شوق سے کہ جاں سے گزر جانا چاہیئے
 بول اے بوائے شہر کدھر جانا چاہیئے
 کب تک اسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
 کوئے مراد سے بھی ادھر جانا چاہیئے
 وہ وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
 گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیئے
 اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
 جس سمت بھی ہو گرد سفر جانا چاہیئے
 کچھ تو ثبوت خون تمنا کہیں ملے
 بے دل تھی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیئے
 یا اپنی خواہشوں کو مقدس نہ جانتے
 یا خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیئے
 کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
 جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے
 اب تو ہمیں بھی ترک مراسم کا دکھ نہیں
 پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے
 تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
 خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے
 اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھائیے
 تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے
 تجھ کو بھلا کے دل ہے وہ شرمندہ نظر
 اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے
 چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
 دنیا تو عرض حال سے بے ابرو کرے
 اس قدر مسلسل تھیں شدتیں جدائی کی
 آج پہلی بار اس سے میں نے بے وفائی کی
 ورنہ اب تلک یوں تھا خواہشوں کی بارش میں
 یا تو ٹوٹ کر رویا یا غزل سرائی کی
 تج دیا تھا کل جن کو ہم نے تیری چاہت میں
 آج ان سے مجبوراً تازہ آشنائی کی
 ہو چلا تھا جب مجھ کو اختلاف اپنے سے
 تو نے کس گھڑی ظالم میری ہم نوائی کی
 ترک کر چکے قاصد کوئے نامراداں کو
 کون اب خبر لاوے شہر آشنائی کی
 طنز و طعن و تہمت سب ہنر ہیں ناصح کے
 آپ سے کوئی پوچھے ہم نے کیا برائی کی
 پھر قفس میں شور اٹھا قیدیوں کا اور صیاد
 دیکھنا اڑا دے گا پھر خبر ربائی کی
 دکھ ہوا جب اس در پر کل فراز کو دیکھا
 لاکھ عیب تھے اس میں خو نہ تھی گدائی کی
 یوں ہی مر مر کے جنیں وقت گزارے جائیں
 زندگی ہم ترے ہاتھوں سے نہ مارے جائیں
 اب زمیں پر کوئی گوتم نہ محمد نہ مسیح
 آسمانوں سے نئے لوگ اتارے جائیں
 وہ جو موجود نہیں اس کی مدد چاہتے ہیں
 وہ جو سنتا ہی نہیں اس کو پکارے جائیں

باپ لرزاں ہے کہ پہنچی نہیں بارات اب تک
 اور ہم جویاں دلہن کو سنوارے جائیں
 ہم کہ نادان جواہری ہیں سبھی جانتے ہیں
 دل کی بازی ہو تو جی جان سے ہارے جائیں
 تاج دیا تم نے در یار بھی اکٹا کے فراز
 اب کہاں ڈھونڈھنے غم خوار تمہارے جائیں
 جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
 لوگ آرام سے سوئے ہوں گے
 بعض اوقات ہم مجبورئ دل
 ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے
 صبح تک دست صبا نے کیا کیا
 پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے
 وہ سفینے جنہیں طوفان نہ ملے
 ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے
 رات بھر بنستے ہوئے تاروں نے
 ان کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے
 کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فراز
 ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے
 جو غیر تھے وہ اسی بات پر ہمارے ہوئے
 کہ ہم سے دوست بہت ہے خبر ہمارے ہوئے
 کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی
 بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے
 اب اک ہجوم شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے
 جنہیں کوئی نہ ملا ہم سفر ہمارے ہوئے
 کسی نے غم تو کسی نے مزاج غم بخشا
 سب اپنی اپنی جگہ چارہ گر ہمارے ہوئے
 بجھا کے طاق کی شمعیں نہ دیکھ تاروں کو
 اسی جنوں میں تو برباد گھر ہمارے ہوئے
 وہ اعتماد کہاں سے فراز لائیں گے
 کسی کو چھوڑ کے وہ اب اگر ہمارے ہوئے
 میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا
 قریحہ فال مرے نام کا اکثر نکلا
 تھا جنہیں زعم وہ دریا بھی مجھی میں ڈوبے
 میں کہ صحرا نظر آتا تھا سمندر نکلا
 میں نے اس جان بہاراں کو بہت یاد کیا
 جب کوئی پھول مری شاخ ہنر پر نکلا
 شہر والوں کی محبت کا میں قائل ہوں مگر
 میں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا
 تو یہیں بار گیا ہے مرے بزدل دشمن
 مجھ سے تنہا کے مقابل ترا لشکر نکلا
 میں کہ صحرائے محبت کا مسافر تھا فراز
 ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا
 اس کا اپنا ہی کرشمہ ہے فسوں ہے یوں ہے
 یوں تو کہنے کو سبھی کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
 جیسے کوئی در دل پر ہو ستادہ کب سے
 ایک سایہ نہ دروں ہے نہ بروں ہے یوں ہے
 تم نے دیکھی ہی نہیں دشت وفا کی تصویر
 نوک بر خار پہ اک قطرہ خوں ہے یوں ہے
 تم محبت میں کہاں سود و زیاں لے آئے
 عشق کا نام خرد ہے نہ جنوں ہے یوں ہے

اب تم آئے ہو مری جان تماشا کرنے
 اب تو دریا میں تلاطم نہ سکوں ہے یوں ہے
 ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
 روز آ جاتا ہے سمجھاتا ہے یوں ہے یوں ہے
 شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فراز
 یہ بھی اک سلسلہ کن فیکوں ہے یوں ہے
 وحشتیں بڑھتی گئیں بجر کے آزار کے ساتھ
 اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ
 ہم نے اک عمر بسر کی ہے غم یار کے ساتھ
 میر دو دن نہ جنے بجر کے آزار کے ساتھ
 اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
 طاق پر عزت سادات بھی دستار کے ساتھ
 اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
 چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ
 ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
 اس ہم تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ
 شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجئے گا
 ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ
 ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
 لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ
 جو شرف ہم کو ملا کوچہ جانان سے فراز
 سوئے مقتل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ
 منتظر کب سے تحیر ہے تری تقریر کا
 بات کر تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا
 رات کیا سونے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
 خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا
 کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
 مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا
 جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکانا رہے
 میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا
 جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر
 آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا
 عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ ہے مہر لوگ
 جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شیر کا
 جس کو بھی چاہا اسے شدت سے چاہا ہے فراز
 سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا
 عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
 خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا
 یہ کون پھر سے انہیں راستوں میں چھوڑ گیا
 ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا
 یہ تیر دل میں مگر ہے سبب نہیں اترا
 کوئی تو حرف لب چارہ گر سے نکلا تھا
 یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
 یہی دھواں مرے دیوار و در سے نکلا تھا
 میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
 کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا
 یہ اب جو سر میں خمیدہ کلاہ کی خاطر
 یہ عیب بھی تو ہم اہل ہنر سے نکلا تھا
 وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز
 تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
 پھر جو بھی در ملا ہے اسی در کے ہو گئے
 پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
 اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے
 کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
 اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے
 اے یاد یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
 اے درد ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے
 سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحان شہر
 پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے
 اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کہ ہم
 اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے
 روتے ہو اک جزیرہ جاں کو فراز تم
 دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے
 مثال دست زلیخا تپاک چاہتا ہے
 یہ دل بھی دامن یوسف ہے چاک چاہتا ہے
 دعائیں دو مرے قاتل کو تم کہ شہر کا شہر
 اسی کے ہاتھ سے ہونا ہلاک چاہتا ہے
 فسانہ گو بھی کرے کیا کہ ہر کوئی سر بزم
 مال قصہ دل دردناک چاہتا ہے
 ادھر ادھر سے کئی آ رہی ہیں آوازیں
 اور اس کا دھیان بہت انہماک چاہتا ہے
 ذرا سی گرد بوس دل پہ لازمی ہے فراز
 وہ عشق کیا ہے جو دامن کو پاک چاہتا ہے
 تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
 لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ
 اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
 خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ
 بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
 دم ہم دم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ
 کیا خبر ان کو کہ دامن بھی بھڑک اٹھتے ہیں
 جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ
 گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
 خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ
 بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
 کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ
 ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
 برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ
 ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
 رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ
 نہ حریف جاں نہ شریک غم شب انتظار کوئی تو ہو
 کسے بزم شوق میں لائیں ہم دل بے قرار کوئی تو ہو
 کسے زندگی بے عزیز اب کسے آرزوئے شب طرب
 مگر اے نگار وفا طلب ترا اعتبار کوئی تو ہو
 کہیں تار دامن گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
 کہ نشان فصل بہار کا سر شاخسار کوئی تو ہو
 یہ اداس اداس سے بام و در یہ اجاڑ اجاڑ سی رہگزر
 چلو ہم نہیں نہ سہمی مگر سر کوئے یار کوئی تو ہو
 یہ سکون جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغ دل ہی نہ بجھ چلے
 وہ بلا سے ہو غم عشق یا غم روزگار کوئی تو ہو

سر مقتل شب آرزو رہے کچھ تو عشق کی آبرو
 جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیب دار کوئی تو ہو
 نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
 مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے
 ستم تو یہ ہے کہ عہد ستم کے جاتے ہی
 تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے
 وصال و ہجر کی حسرت میں جوئے کم مابہ
 کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے
 میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہئے پر بھی
 ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے
 وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجے
 کہ جس سے عشق کرو ہے وفا نکلتی ہے
 مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
 لاکھ سمجھایا کہ اس محفل میں اب جانا نہیں
 خود فریبی ہی سہی کیا کیجئے دل کا علاج
 تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں
 ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
 اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں
 جی میں جو آتی ہے کر گزرو کہیں ایسا نہ ہو
 کل پشیمان ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں
 زندگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہوگا فراز
 اس کا یہ کہنا کہ تو شاعر ہے دیوانا نہیں
 دل گرفتہ ہی سہی بزم سجا لی جائے
 یاد جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے
 رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
 اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے
 مصحف رخ ہے کسی کا کہ بیاض حافظ
 ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے
 وہ مروت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
 میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے
 بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز
 کس طرح سے مری اشفتہ خیالی جائے
 اب کیا سوچیں کیا حالات تھے کس کارن یہ زہر پیا ہے
 ہم نے اس کے شہر کو چھوڑا اور آنکھوں کو موند لیا ہے
 اپنا یہ شیوہ تو نہیں تھا اپنے غم اوروں کو سونپیں
 خود تو جاگئے یا سوتے ہیں اس کو کیوں ہے خواب کیا ہے
 خلقت کے آوازے بھی تھے بند اس کے دروازے بھی تھے
 پھر بھی اس کوچے سے گزرے پھر بھی اس کا نام لیا ہے
 ہجر کی رت جاں لیوا تھی پر غلط سبھی اندازے نکلے
 تازہ رفاقت کے موسم تک میں بھی گیا ہوں وہ بھی گیا ہے
 ایک فراز تمہیں تنہا ہو جو اب تک دکھ کے رسیا ہو
 ورنہ اکثر دل والوں نے درد کا رستہ چھوڑ دیا ہے
 یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
 وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے
 یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
 کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے
 ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
 یہ منظر بار بار دیکھا نہ جائے
 غلط ہے جو سنا پر آزما کر
 تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے

یہ محرومی نہیں پاس وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے
یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے
یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے
فراز اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے
تس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو
وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹ میرے شانے پر
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو
چٹخ اٹھا ہو سلگتی چٹان کی صورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو
تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو
یہ اور بات کہ اکثر دمک اٹھا چہرہ
کیھی کیھی یہی شعلہ بجھا گیا مجھ کو
یہ قربتیں ہی تو وجہ فراق ٹھہری ہیں
بہت عزیز ہیں یاران ہے وفا مجھ کو
ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو
اسے فراز اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو
نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں
نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں
ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب ادھر کو دیکھتے ہیں
عجب فسوں خریدار کا اثر ہے کہ ہم
اسی کی آنکھ سے اپنے ہنر کو دیکھتے ہیں
فراز در خور سجدہ بر آستانہ نہیں
ہم اپنے دل کے حوالے سے در کو دیکھتے ہیں
گماں یہی ہے کہ دل خود ادھر کو جاتا ہے
سو شک کا فائدہ اس کی نظر کو جاتا ہے
حدیں وفا کی بھی آخر بوس سے ملتی ہیں
یہ راستہ بھی ادھر سے ادھر کو جاتا ہے
یہ دل کا درد تو عمروں کا روگ ہے پیارے
سو جائے بھی تو پہر دو پہر کو جاتا ہے
یہ حال ہے کہ کئی راستے ہیں پیش نظر
مگر خیال تری رہگزر کو جاتا ہے
تو انوریٰ ہے نہ غالب تو پہر یہ کیوں ہے فراز
ہر ایک سیل بلا تیرے گھر کو جاتا ہے
ہوا کے زور سے پندار بام و در بھی گیا
چراغ کو جو بجائے تھے ان کا گھر بھی گیا
پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا
اب احتیاط کی دیوار کیا اٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

میں چپ رہا کہ اسی میں تھی عافیت جاں کی
 کوئی تو میری طرح تھا جو دار پر بھی گیا
 سلگتے سوچتے ویران موسموں کی طرح
 کڑا تھا عہد جوانی مگر گزر بھی گیا
 جسے بھلا نہ سکا اس کو یاد کیا رکھتا
 جو نام لب پہ رہا ذہن سے اتر بھی گیا
 پھٹی پھٹی بوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
 تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا
 مگر فلک کو عداوت اسی کے گھر سے تھی
 جہاں فراز نہ تھا سیل غم ادھر بھی گیا
 لے اڑا پھر کوئی خیال ہمیں
 ساقیا ساقیا سنبھال ہمیں
 رو رہے ہیں کہ ایک عادت ہے
 ورنہ اتنا نہیں ملال ہمیں
 خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم
 اُننے کی طرح سنبھال ہمیں
 مرگ انبوہ جشن شادی ہے
 مل گئے دوست حسب حال ہمیں
 اختلاف جہاں کا رنج نہ تھا
 دے گئے مات ہم خیال ہمیں
 کیا توقع کریں زمانے سے
 ہو بھی گر جرات سوال ہمیں
 ہم یہاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن
 اپنی محفل سے مت نکال ہمیں
 ہم ترے دوست ہیں فراز مگر
 اب نہ اور الجھنوں میں ڈال ہمیں
 ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
 کہ ہم کو دست زمانہ سے زخم کاری لگے
 اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
 کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے
 بظاہر ایک ہی شب ہے فراق یار مگر
 کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے
 علاج اس دل درد آشنا کا کیا کیجے
 کہ تیر بن کے جسے حرف غم گساری لگے
 ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
 ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے
 فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
 یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے
 سبھی کہیں مرے غم خوار کے علاوہ بھی
 کوئی تو بات کروں یار کے علاوہ بھی
 بہت سے ایسے ستم گر تھے اب جو یاد نہیں
 کسی حبیب دل آزار کے علاوہ بھی
 یہ کیا کہ تم بھی سر راہ حال پوچھتے ہو
 کبھی ملو ہمیں بازار کے علاوہ بھی
 اجاڑ گھر میں یہ خوشبو کہاں سے آئی ہے
 کوئی تو ہے در و دیوار کے علاوہ بھی
 سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقیں آیا
 کہ پھول کھلتے ہیں گل زار کے علاوہ بھی
 کبھی فراز سے آ کر ملو جو وقت ملے
 یہ شخص خوب ہے اشعار کے علاوہ بھی

دل منافق تھا شب بجر میں سویا کیسا
 اور جب تجھ سے ملا ٹوٹ کے رویا کیسا
 زندگی میں بھی غزل ہی کا قرینہ رکھا
 خواب در خواب ترے غم کو پرویا کیسا
 اب تو چہروں پہ بھی کتبوں کا گماں ہوتا ہے
 آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں لب گویا کیسا
 دیکھ اب قرب کا موسم بھی نہ سرسبز لگے
 بجر ہی بجر مراسم میں سمویا کیسا
 ایک آنسو تھا کہ دریائے ندامت تھا فراز
 دل سے بے باک شناور کو ڈبویا کیسا
 جان سے عشق اور جہاں سے گریز
 دوستوں نے کیا کہاں سے گریز
 ابتدا کی تیرے قصیدے سے
 اب یہ مشکل کروں کہاں سے گریز
 میں وہاں ہوں جہاں جہاں تم ہو
 تم کرو گے کہاں کہاں سے گریز
 کر گیا میرے تیرے قصے میں
 داستان گو یہاں وہاں سے گریز
 جنگ باری نہ تھی ابھی کہ فراز
 کر گئے دوست درمیاں سے گریز
 کہا تھا کس نے کہ عہد وفا کرو اس سے
 جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے
 نصیب پھر کوئی تقریب قرب ہو کہ نہ ہو
 جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اس سے
 یہ اہل بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
 ذرا فسانہ دل ابتدا کرو اس سے
 یہ کیا کہ تم ہی غم بجر کے فسانے کہو
 کبھی تو اس کے بہانے سنا کرو اس سے
 فراز ترک تعلق تو خیر کیا ہوگا
 یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اس سے
 خود کو ترے معیار سے گھٹ کر نہیں دیکھا
 جو چھوڑ گیا اس کو پلٹ کر نہیں دیکھا
 میری طرح تو نے شب بجران نہیں کاٹی
 میری طرح اس تیغ پہ کٹ کر نہیں دیکھا
 تو دشمن نفرت ہی کو لہراتا رہا ہے
 تو نے کبھی دشمن سے لپٹ کر نہیں دیکھا
 تھے کوچہ جانان سے پرے بھی کئی منظر
 دل نے کبھی اس راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا
 اب یاد نہیں مجھ کو فراز اپنا بھی پیکر
 جس روز سے بکھرا ہوں سمٹ کر نہیں دیکھا
 یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جدا
 لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا
 گر غم سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
 کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے بار جدا
 دو گھڑی اس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
 جس طرح سایہ دیوار سے دیوار جدا
 یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
 میں جدا گریہ کناں ابر جدا بار جدا
 کچ کلابوں سے کہے کون کہ اے بے خبروں
 طوق گردن سے نہیں طرہ دستار جدا

کوئے جانان میں بھی خاصا تھا طرح دار فراز
 لیکن اس شخص کی سچ دھج تھی سر دار جدا
 گلہ فضول تھا عہد وفا کے ہوتے ہوئے
 سو چپ رہا ستم ناروا کے ہوتے ہوئے
 یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
 بے آشنا کی طلب آشنا کے ہوتے ہوئے
 وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں شمار کریں
 چراغ ہم نے جلانے ہوا کے ہوتے ہوئے
 نہ چاہئے ہم بھی تجھ کو خدا سے مانگ لیا
 یہ حال ہے دل بے مدعا کے ہوتے ہوئے
 نہ کر کسی ہم بھروسہ کہ کشتیاں ڈوبیں
 خدا کے ہوتے ہوئے ناخدا کے ہوتے ہوئے
 مگر یہ اہل ریا کس قدر برہنہ ہیں
 گلیم و دلق و عبا و قبا کے ہوتے ہوئے
 کسے خبر ہے کہ کاسہ بدست پھرتے ہیں
 بہت سے لوگ سروں پر ہما کے ہوتے ہوئے
 فراز ایسے بھی لمحے کبھی کبھی آئے
 کہ دل گرفتہ رہے دل رہا کے ہوتے ہوئے
 یہ شہر سحر زدہ ہے صدا کسی کی نہیں
 یہاں خود اپنے لیے بھی دعا کسی کی نہیں
 خزاں میں چاک گریباں تھا میں بہار میں تو
 مگر یہ فصل ستم آشنا کسی کی نہیں
 سب اپنے اپنے فسانے سناتے جاتے ہیں
 نگاہ یار مگر ہم نوا کسی کی نہیں
 میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
 چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں
 فراز اپنی جگر کاویوں پہ ناز نہ کر
 کہ یہ متاع ہنر بھی سدا کسی کی نہیں
 وہ دشمن جاں جان سے پیارا بھی کبھی تھا
 اب کس سے کہیں کوئی ہمارا بھی کبھی تھا
 اترا بے رگ و بے میں تو دل کٹ سا گیا ہے
 یہ زہر جدائی کہ گوارا بھی کبھی تھا
 ہر دوست جہاں ابر گریزاں کی طرح ہے
 یہ شہر کبھی شہر ہمارا بھی کبھی تھا
 تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
 ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا
 اب اگلے زمانے کے ملیں لوگ تو پوچھیں
 جو حال ہمارا ہے تمہارا بھی کبھی تھا
 ہر بزم میں ہم نے اسے افسردہ ہی دیکھا
 کہتے ہیں فراز انجمن آرا بھی کبھی تھا
 جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
 دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی
 تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو
 یہ چوٹ کسی صاحب محفل سے لگی تھی
 اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
 بے درد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی
 خلقت کا عجب حال تھا اس کوئے ستم میں
 سائے کی طرح دامن قائل سے لگی تھی
 اترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہوا دریا
 جب کشتی جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

دل بدن کا شریک حال کہاں
 بحر پھر بحر ہے وصال کہاں
 عشق ہے نام انتہاؤں کا
 اس سمندر میں اعتدال کہاں
 ایسا نشہ تو زہر میں بھی نہ تھا
 اے غم دل تری مثال کہاں
 ہم کو بھی اپنی پائمالی کا
 ہے مگر اس قدر ملال کہاں
 میں نئی دوستی کے موڑ پہ تھا
 آگیا ہے ترا خیال کہاں
 دل کہ خوش فہم تھا سو ہے ورنہ
 تیرے ملنے کا احتمال کہاں
 وصل و بھراں ہیں اور دنیاہیں
 ان زمانوں میں ماہ و سال کہاں
 تجھ کو دیکھا تو لوگ حیراں ہیں
 آگیا شہر میں غزال کہاں
 تجھ پہ لکھی تو سچ گئی ہے غزل
 آ ملا خواب سے خیال کہاں
 اب تو شبہ مات ہو رہی ہے فراز
 اب بچاؤ کی کوئی چال کہاں
 سب قرینے اسی دل دار کے رکھ دیتے ہیں
 ہم غزل میں بھی ہنر یار کے رکھ دیتے ہیں
 شاید آجائیں کبھی چشم خریدار میں ہم
 جان و دل بیچ میں بازار کے رکھ دیتے ہیں
 تاکہ طعنہ نہ ملے ہم کو تنک طرفی کا
 ہم قدح سامنے اغیار کے رکھ دیتے ہیں
 اب کسے رنج اسیری کہ قفس میں صیاد
 سارے منظر گل و گلزار کے رکھ دیتے ہیں
 ذکر جاناں میں یہ دنیا کو کہاں لے آئے
 لوگ کیوں مسئلے ہے کار کے رکھ دیتے ہیں
 وقت وہ رنگ دکھاتا ہے کہ اہل دل بھی
 طاق نسیاں پہ سخن یار کے رکھ دیتے ہیں
 زندگی تیری امانت ہے مگر کیا کیجے
 لوگ یہ بوجھ بھی تھک بار کے رکھ دیتے ہیں
 ہم تو چاہت میں بھی غالب کے مقلد ہیں فراز
 جس پہ مرتے ہیں اسے مار کے رکھ دیتے ہیں
 فقیہ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہوا
 کہ اس سے مل کے مزاج اور کافرانہ ہوا
 ابھی ابھی وہ ملا تھا ہزار باتیں کیں
 ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا
 وہ رات بھول چکو وہ سخن نہ دہراؤ
 وہ رات خواب ہوئی وہ سخن فسانہ ہوا
 کچھ اب کے ایسے کڑے تھے فراق کے موسم
 تری ہی بات نہیں میں بھی کیا سے کیا نہ ہوا
 بجوم ایسا کہ راہیں نظر نہیں آتیں
 نصیب ایسا کہ اب تک تو قافلہ نہ ہوا
 شہید شب فقط احمد فراز ہی تو نہیں
 کہ جو چراغ بکف تھا وہی نشانہ ہوا
 چل نکلتی ہیں غم یار سے باتیں کیا کیا
 ہم نے بھی کیں در و دیوار سے باتیں کیا کیا

بات بن آئی ہے پھر سے کہ مرے بارے میں
 اس نے پوچھیں مرے غم خوار سے باتیں کیا کیا
 لوگ لب بستہ اگر ہوں تو نکل آتی ہیں
 چپ کے پیرایہ اظہار سے باتیں کیا کیا
 کسی سودائی کا قصہ کسی ہرجائی کی بات
 لوگ لے آتے ہیں بازار سے باتیں کیا کیا
 ہم نے بھی دست شناسی کے بہانے کی ہیں
 ہاتھ میں ہاتھ لیے پیار سے باتیں کیا کیا
 کس کو بکنا تھا مگر خوش ہیں کہ اس حیلے سے
 ہو گئیں اپنے خریدار سے باتیں کیا کیا
 ہم ہیں خاموش کہ مجبور محبت تھے فراز
 ورنہ منسوب ہیں سرکار سے باتیں کیا کیا
 تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں
 میں زخم زخم ہوں پھر بھی تجھے دکھائی نہ دوں
 ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
 یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دوں
 خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
 کہ اب کبھی اسے الزام ہے وفائی نہ دوں
 مری بقا ہی مری خواہش گناہ میں ہے
 میں زندگی کو کبھی زہر پارسائی نہ دوں
 جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ حرف کیوں آئے
 حریف جاں کو کبھی طعن آشنائی نہ دوں
 مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محو آنہ داری
 میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں
 یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد
 کہ دوسروں کو تو الزام نارسائی نہ دوں
 فراز دولت دل ہے متاع محرومی
 میں جام جم کے عوض کاسہ گدائی نہ دوں
 بھید پائیں تو رہ یار میں گم ہو جائیں
 ورنہ کس واسطے ہے کار میں گم ہو جائیں
 کیا کریں عرض تمنا کہ تجھے دیکھتے ہی
 لفظ پیرایہ اظہار میں گم ہو جائیں
 یہ نہ ہو تم بھی کسی بھیڑ میں کھو جاؤ کہیں
 یہ نہ ہو ہم کسی بازار میں گم ہو جائیں
 کس طرح تجھ سے کہیں کتنا بھلا لگتا ہے
 تجھ کو دیکھیں ترے دیدار میں گم ہو جائیں
 ہم ترے شوق میں یوں خود کو گنوا بیٹھے ہیں
 جیسے بچے کسی تیوبار میں گم ہو جائیں
 پیچھ اتتے بھی نہ دو کرمک ریشم کی طرح
 دیکھنا سر ہی نہ دستار میں گم ہو جائیں
 ایسا آشوب زمانہ ہے کہ ڈر لگتا ہے
 دل کے مضمون ہی نہ اشعار میں گم ہو جائیں
 شہریاروں کے بلاوے بہت آتے ہیں فراز
 یہ نہ ہو آپ بھی دربار میں گم ہو جائیں
 عشق نشہ ہے نہ جادو جو اتر بھی جائے
 یہ تو اک سیل بلا ہے سو گزر بھی جائے
 تلخ کام و دین کب سے عذاب جاں ہے
 اب تو یہ زہر رگ و پے میں اتر بھی جائے
 اب کے جس دشت تمنا میں قدم رکھا ہے
 دل تو کیا چیز ہے اماں ہے کہ سر بھی جائے

ہم بگولوں کی طرح خاک بسر پھرتے ہیں
 پاؤں شل ہوں تو ہم آشوب سفر بھی جائے
 لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
 کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے
 شہر جاننا سے پرے بھی کئی دنیائیں ہیں
 بے کوئی ایسا مسافر جو ادھر بھی جائے
 اس قدر قرب کے بعد ایسے جدا ہو جانا
 کوئی کم حوصلہ انساں ہو تو مر بھی جائے
 ایک مدت سے مقدر بے غریب الوطنی
 کوئی پردیس میں نا خوش ہو تو گھر بھی جائے
 اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
 لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا
 میرے جھوٹ کو تولو بھی اور کھولو بھی تم
 لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا
 کل تاریخ یقیناً خود کو دہرائے گی
 آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا
 بزم میں یاروں کی شمشیر کے جوہر دیکھو
 رزم میں لیکن تلواروں کو میان میں رکھنا
 اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
 اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا
 اس موسم میں گل دانوں کی رسم کہاں ہے
 لوگو اب پھولوں کی آتش دان میں رکھنا
 سب لوگ لیے سنگ ملامت نکل آئے
 کس شہر میں ہم اہل محبت نکل آئے
 اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
 آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے
 ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ نہ جانے
 کس بام سے خورشید قیامت نکل آئے
 جو دریئے پندار ہیں ان قتل گہوں سے
 جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے
 اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہد ستم کی
 اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے
 یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
 شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے
 کیوں نہ ہم عہد رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
 شاید اس زخم کو بھرنے میں زمانے لگ جائیں
 نہیں ایسا بھی کہ اک عمر کی قربت کے نشے
 ایک دو روز کی رنجش سے ٹھکانے لگ جائیں
 یہی ناصح جو ہمیں تجھ سے نہ ملنے کو کہیں
 تجھ کو دیکھیں تو تجھے دیکھنے آئے لگ جائیں
 ہم کہ ہیں لذت آزار کے مارے ہوئے لوگ
 چارہ گر آئیں تو زخموں کو چھپانے لگ جائیں
 ربط کے سینکڑوں حیلے ہیں محبت نہ سہی
 ہم ترے ساتھ کسی اور بہانے لگ جائیں
 ساقیا مسجد و مکتب تو نہیں مے خانہ
 دیکھنا پھر بھی غلط لوگ نہ آئے لگ جائیں
 قرب اچھا ہے مگر اتنی بھی شدت سے نہ مل
 یہ نہ ہو تجھ کو مرے روگ پرانے لگ جائیں
 اب فراز آؤ چلیں اپنے قبیلے کی طرف
 شاعری ترک کریں بوجھ اٹھانے لگ جائیں

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا
 جب اپنے طور پہی تھے تو کیا گلہ اس کا
 وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
 اسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اس کا
 وہ برق رو تھا مگر وہ گیا کہاں جانے
 اب انتظار کریں گے شکستہ پا اس کا
 چلو یہ سیل بلا خیز ہی بنے اپنا
 سفینہ اس کا خدا اس کا ناخدا اس کا
 یہ اہل درد بھی کس کی دبائی دیتے ہیں
 وہ چپ بھی ہو تو زمانہ بے ہم نوا اس کا
 ہمیں نے ترک تعلق میں پہل کی کہ فراز
 وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اس کا
 پیام آئے ہیں اس یار بے وفا کے مجھے
 جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے
 جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
 فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے
 نشے سے کم تو نہیں یاد یار کا عالم
 کہ لے اڑا بے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے
 میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
 اداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے
 تمہارے بام سے اب کم نہیں بے رفعت دار
 جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اٹھا کے مجھے
 کھنچی ہوئی بے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
 فراز دیکھ رہا بے وہ مسکرا کے مجھے
 جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اترنے لگے
 ہوا چلی بے تو جھونکے اداس کرنے لگے
 گئی رتوں کا تعلق بھی جان لیوا تھا
 بہت سے پھول نئے موسموں میں مرنے لگے
 وہ مدتوں کی جدائی کے بعد ہم سے ملا
 تو اس طرح سے کہ اب ہم گریز کرنے لگے
 غزل میں جیسے ترے خد و خال بول اٹھیں
 کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے
 بہت دنوں سے وہ گمبھیر خاموشی بے فراز
 کہ لوگ اپنے خیالوں سے آپ ڈرنے لگے
 چاک پیرا بنی گل کو صبا جانتی بے
 مستی شوق کہاں بند قبا جانتی بے
 ہم تو بدنام محبت تھے سو رسوا ٹھہرے
 ناصحوں کو بھی مگر خلق خدا جانتی بے
 کون طاقوں پہ رہا کون سر راہ گزر
 شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی بے
 بوس انعام سمجھتی بے کرم کو تیرے
 اور محبت بے کہ احساں کو سزا جانتی بے
 وحشت دل صلہ اہلہ پائی لے لے
 مجھ سے یارب مرے لفظوں کی کمائی لے لے
 عقل ہر بار دکھاتی تھی جلے ہاتھ اپنے
 دل نے ہر بار کہا آگ پرانی لے لے
 میں تو اس صبح درخشاں کو تونگر جانوں
 جو مرے شہر سے کشکول کدائی لے لے
 تو غنی بے مگر اتنی ہیں شرائط تیری
 وہ محبت جو ہمیں راس نہ آئی لے لے

ایسا نادان خریدار بھی کوئی ہوگا
 جو ترے غم کے عوض ساری خدائی لے لے
 اپنے دیوان کو گلیوں میں لیے پھرتا ہوں
 بے کوئی جو ہنر زخم نمائی لے لے
 میری خاطر نہ سہی اپنی انا کی خاطر
 اپنے بندوں سے تو پندار خدائی لے لے
 اور کیا نذر کروں اے غم دل دار فراز
 زندگی جو غم دنیا سے بچائی لے لے
 جب ہر اک شہر بلاؤں گا ٹھکانہ بن جائے
 کیا خبر کون کہاں کس کا نشانہ بن جائے
 عشق خود اپنے رقیبوں کو بہم کرتا ہے
 ہم جسے پیار کریں جان زمانہ بن جائے
 اتنی شدت سے نہ مل تو کم جدائی چاہیں
 یہی قربت تری دوری کا بہانہ بن جائے
 جو غزل آج ترے ہجر میں لکھی ہے وہ کل
 کیا خبر اہل محبت کا ترانہ بن جائے
 کرتا رہتا ہوں فراہم میں زر زخم کہ یوں
 شاید آئندہ زمانوں کا خزانہ بن جائے
 اس سے بڑھ کر کوئی انعام ہنر کیا ہے فراز
 اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ بن جائے
 اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
 لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا
 میرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی تم
 لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا
 کل تاریخ یقیناً خود کو دہرائے گی
 آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا
 بزم میں یاروں کی شمشیر لہو میں تر ہے
 رزم میں لیکن تلوار کو میان میں رکھنا
 آج تو اے دل ترک تعلق پر تم خوش ہو
 کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا
 اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
 اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا
 اس موسم میں گل دانوں کی رسم کہاں ہے
 لوگو اب پھولوں کو آتش دان میں رکھنا
 یہ میں بھی کیا ہوں اسے بھول کر اسی کا رہا
 کہ جس کے ساتھ نہ تھا ہم سفر اسی کا رہا
 وہ بت کہ دشمن دیں تھا بقول ناصح کے
 سوال سجدہ جب آیا تو در اسی کا رہا
 ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
 کہا جو دل نے سخن معتبر اسی کا رہا
 بہت سی خوابشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
 میں کس طرح سے کہوں عمر بھر اسی کا رہا
 کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فراز
 اسی لیے کف قاتل پہ سر اسی کا رہا
 کل ہم نے بزم یار میں کیا کیا شراب پی
 صحرا کی تشنگی تھی سو دریا شراب پی
 اپنوں نے تچ دیا ہے تو غیروں میں جا کے بیٹھ
 اے خانماں خراب نہ تنہا شراب پی
 تو ہم سفر نہیں ہے تو کیا سیر گلستاں
 تو ہم سب تو نہیں ہے تو پھر کیا شراب پی

اے دل گرفتہ غم جاناں سیو اٹھا
 اے کشتہ جفائے زمانہ شراب پی
 اک مہرباں بزرگ نے یہ مشورہ دیا
 دکھ کا کوئی علاج نہیں جا شراب پی
 بادل گرج رہا تھا ادھر محتسب ادھر
 پھر جب تلک یہ عقدہ نہ سلجھا شراب پی
 اے تو کہ تیرے در پہ ہیں رندوں کے جمگھٹے
 اک روز اس فقیر کے گھر آ شراب پی
 دو جام ان کے نام بھی اے پیر میکدہ
 جن رفتگاں کے ساتھ ہمیشہ شراب پی
 کل ہم سے اپنا یار خفا ہو گیا فراز
 شاید کہ ہم نے حد سے زیادہ شراب پی
 نہ تیرا قرب نہ بادہ بے کیا کیا جائے
 پھر آج دکھ بھی زیادہ بے کیا کیا جائے
 ہمیں بھی عرض تمنا کا ڈھب نہیں آتا
 مزاج یار بھی سادہ بے کیا کیا جائے
 کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش بھرتے ہیں
 کچھ اپنا دل بھی کشادہ بے کیا کیا جائے
 وہ مہرباں بے مگر دل کی حرص بھی کم ہو
 طلب کرم سے زیادہ بے کیا کیا جائے
 نہ اس سے ترک تعلق کی بات کر پائیں
 نہ ہمدی کا ارادہ بے کیا کیا جائے
 سلوک یار سے دل ڈوبنے لگا بے فراز
 مگر یہ محفل اعدا بے کیا کیا جائے
 ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
 کون دریا کو الٹا کون گوہر دیکھتا
 وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
 تیرے باتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا
 آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
 اس توقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھتا
 میری قسمت کی لکیریں میرے باتھوں میں نہ تھیں
 تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدر دیکھتا
 زندگی پھیلی ہوئی تھی شام بچراں کی طرح
 کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا
 ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا بجوم
 پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا
 تو بھی دل کو ایک خوں کی بوند سمجھا بے فراز
 آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا
 سارا شہر بلکتا بے
 پھر بھی کیسا سکتہ بے
 گلیوں میں بارود کی بو
 یا پھر خون مہکتا بے
 سب کے بازو یخ بستہ
 سب کا جسم دہکتا بے
 ایک سفر وہ بے جس میں
 پاؤں نہیں دل تھکتا بے
 ہم تو خوش تھے کہ چلو دل کا جنوں کچھ کم بے
 اب جو آرام بہت بے تو سکوں کچھ کم بے
 رنگ گریہ نے دکھائی نہیں اگلی سی بہار
 اب کے لگتا بے کہ آمیزش خوں کچھ کم بے

اب ترا بحر مسلسل ہے تو یہ بھید کھلا
 غم دل سے غم دنیا کا فسوں کچھ کم ہے
 اس نے دکھ سارے زمانے کا مجھے بخش دیا
 پھر بھی لالچ کا تقاضا ہے کہوں کچھ کم ہے
 راہ دنیا سے نہیں دل کی گزر گاہ سے ا
 فاصلہ گرچہ زیادہ ہے ہم یوں کچھ کم ہے
 تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو بھلے وقتوں میں
 یہ خرابی کہ میں جس حال میں ہوں کچھ کم ہے
 آگ ہی آگ مرے قریب تن میں ہے فراز
 پھر بھی لگتا ہے ابھی سوز دروں کچھ کم ہے
 جب یار نے رخت سفر باندھا کب ضبط کا پارا اس دن تھا
 ہر درد نے دل کو سہلایا کیا حال ہمارا اس دن تھا
 جب خواب ہوئیں اس کی آنکھیں جب دھند ہوا اس کا چہرہ
 ہر اشک ستارہ اس شب تھا ہر زخم انگارہ اس دن تھا
 سب یاروں کے ہوتے سوتے ہم کس سے گلے مل کر روتے
 کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں کب شہر ہمارا اس دن تھا
 جب تجھ سے ذرا غافل ٹھہرے ہر یاد نے دل پر دستک دی
 جب لب پہ تمہارا نام نہ تھا ہر دکھ نے پکارا اس دن تھا
 اک تم ہی فراز نہ تھے تنہا اب کے تو بلا واجب آئی
 اک بھیڑ لگی تھی مقتل میں ہر درد کا مارا اس دن تھا
 یہ ہے دلی ہے تو کشتی سے یار کیا اتریں
 ادھر بھی کون ہے دریا کے پار کیا اتریں
 تمام دولت جاں بار دی محبت میں
 جو زندگی سے لیے تھے ادھار کیا اتریں
 بزار جام سے ٹکرا کے جام خالی ہوں
 جو آگئے ہیں دلوں میں غبار کیا اتریں
 بسان خاک سر کوئے یار بیٹھے ہیں
 اب اس مقام سے ہم خاکسار کیا اتریں
 نہ عطر و عود نہ جام و سیو نہ ساز و سرور
 فقیر شہر کے گھر شہریار کیا اتریں
 ہمیں مجال نہیں ہے کہ بام تک پہنچیں
 انہیں یہ عار سر رہ گزار کیا اتریں
 جو زخم داغ بنے ہیں وہ بھر گئے تھے فراز
 جو داغ زخم بنے ہیں وہ یار کیا اتریں
 بیٹھے تھے لوگ پہلو ہم پہلو پیے ہوئے
 اک ہم تھے تیری بزم میں آنسو پیے ہوئے
 دیکھا جسے بھی اس کی محبت میں مست تھا
 جیسے تمام شہر ہو دارو پیے ہوئے
 تکرار ہے سبب تو نہ تھی رند و شیخ میں
 کرتے بھی کیا شراب تھے ہر دو پیے ہوئے
 پھر کیا عجب کہ لوگ بنا لیں کہانیاں
 کچھ میں نشے میں چور تھا کچھ تو پیے ہوئے
 یوں ان لبوں کے مس سے معطر ہوں جس طرح
 وہ نو بہار ناز تھا خوشبو پیے ہوئے
 یوں ہو اگر فراز تو تصویر کیا بنے
 اک شام اس کے ساتھ لب جو پیے ہوئے
 غرور جاں کو مرے یار بیچ دیتے ہیں
 قبا کی حرص میں دستار بیچ دیتے ہیں
 یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خوابشوں کے لیے
 تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں

جنون زینت آرائش مکاں کے لیے
 کئی مکئی در و دیوار بیچ دیتے ہیں
 ذرا بھی نرخ ہو بالا تو تاجران حرم
 گلیم و جبہ و دستار بیچ دیتے ہیں
 بس اتنا فرق ہے یوسف میں اور مجھ میں فراز
 کہ اس کو غیر مجھے یار بیچ دیتے ہیں
 غنیم سے بھی عداوت میں حد نہیں مانگی
 کہ بار مان لی لیکن مدد نہیں مانگی
 بزار شکر کہ ہم اہل حرف زندہ نے
 مجاوران ادب سے سند نہیں مانگی
 بہت ہے لمحہ موجود کا شرف بھی مجھے
 سو اپنے فن سے بقائے ابد نہیں مانگی
 قبول وہ جسے کرتا وہ التجا نہیں کی
 دعا جو وہ نہ کرے مسترد نہیں مانگی
 میں اپنے جامہ صد چاک سے بہت خوش ہوں
 کبھی عبا و قبائے خرد نہیں مانگی
 شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں
 جبھی تو گور کنوں سے لحد نہیں مانگی
 میں سر برہنہ رہا پھر بھی سر کشیدہ رہا
 کبھی کلاہ سے توقیر قد نہیں مانگی
 عطائے درد میں وہ بھی نہیں تھا دل کا غریب
 فراز میں نے بھی بخشش میں حد نہیں مانگی
 غیرت عشق سلامت تھی انا زندہ تھی
 وہ بھی دن تھے کہ رہ و رسم وفا زندہ تھی
 قیس کو دوش نہ دو رکھیو نہ فریاد کو نام
 انہی لوگوں سے محبت کی ادا زندہ تھی
 شہر بیمار کے ہر کوچہ و بام و در پر
 ہم بھی مرتے تھے کہ جب خلق خدا زندہ تھی
 بجھ گئیں شمعیں تو دم توڑ گئے جھونکے بھی
 جس طرح زیر رقابت سے ہوا زندہ تھی
 یاد ایام کہ صحرائے محبت میں فراز
 جرس قافلہ دل کی صدا زندہ تھی
 چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
 پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقش پا کی طرح
 مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
 کوئی ملے مگر اس یار ہے وفا کی طرح
 مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
 کبھی تو آج رس غنچہ کی صدا کی طرح
 وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
 گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح
 کشاں کشاں لیے جاتی ہے جانب منزل
 نفس کی ڈور بھی زنجیر ہے صدا کی طرح
 فراز کس کے ستم کا گلا کریں کس سے
 کہ ہے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح
 جب تری یاد کے جگنو چمکے
 دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے
 سخت تاریک ہے دل کی دنیا
 ایسے عالم میں اگر تو چمکے
 ہم نے دیکھا سر بازار وفا
 کبھی موتی کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدت احساس جمال
رنگ تو رنگ ہے خوشبو چمکے
آنکھ مجبور تماشا ہے فراز
ایک صورت ہے کہ ہر سو چمکے
جب تجھے یاد کریں کار جہاں کھینچتا ہے
اور پھر عشق وہی کوہ گراں کھینچتا ہے
کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اب کے مرا دوست کہاں کھینچتا ہے
عہد فرصت میں کسی پار گزشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگ جاں کھینچتا ہے
دل کے ٹکڑوں کو کہاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازہ آئینہ گراں کھینچتا ہے
انتہا عشق کی کوئی نہ ہوس کی کوئی
دیکھنا یہ ہے کہ حد کون کہاں کھینچتا ہے
کھینچتے جاتے ہیں رسن بستہ غلاموں کی طرح
جس طرف قافلہ عمر رواں کھینچتا ہے
ہم تو ربوار زبوں ہیں وہ مقدر کا سوار
خود ہی مہمیز کرے خود ہی عناں کھینچتا ہے
رشتہ تیغ و گلو اب بھی سلامت ہے فراز
اب بھی مقتل کی طرف دل سا جواں کھینچتا ہے
نظر بچھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے
کرے گا کون تری ہے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسم زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے
مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ ساتھ سب کے گئے
اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لئے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے
گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہ بارا تھا
گرفتہ دل میں مگر حوصلے بھی اب کے گئے
تم اپنی شمع تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے
جو بھی درون دل ہے وہ بابر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا
اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا
یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا
پھر ہو رہا ہوں آج انہیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا
میں جاں بہ لب ہوں ترک تعلق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا
جاناں دل کا شہر نگر افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے
کس چاہت سے زہر تمنا مانگا تھا
اور اب ہاتھوں میں ساغر افسوس کا ہے
اک دہلیز پہ جا کر دل خوش ہوتا تھا
اب تو شہر میں ہر اک در افسوس کا ہے
ہم نے عشق گناہ سے برتر جانا تھا
اور دل پر پہلا پتھر افسوس کا ہے

قربت کے اس پیڑ کی شاخوں پر دیکھو
 پھول اداسی کا ہے ثمر افسوس کا ہے
 بار کے دکھ سے پچھتاوا بڑھ کر ہے فراز
 دکھ کا نہیں افسوس مگر افسوس کا ہے
 ہم بھی شاعر تھے کبھی جان سخن یاد نہیں
 تجھ کو بھولے ہیں تو دل داری فن یاد نہیں
 دل سے کل محو تکلم تھے تو معلوم ہوا
 کوئی کاکل کوئی لب کوئی دہن یاد نہیں
 عقل کے شہر میں آیا ہے تو یوں گم ہے جنوں
 لب گویا کو بھی ہے ساختہ پن یاد نہیں
 اول اول تو نہ تھے واقف آداب قفس
 اور اب رسم و رہ اہل چمن یاد نہیں
 ہر کوئی ناوک و ترکش کی دکان پوچھتا ہے
 کسی گاہک کو مگر اپنا بدن یاد نہیں
 وقت کس دشت فراموشی میں لے آیا ہے
 اب ترا نام بھی خاکم بدین یاد نہیں
 یہ بھی کیا کم ہے غریب الوطنی میں کہ فراز
 ہم کو ہے مہرئ ارباب وطن یاد نہیں
 کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی
 بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی
 وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
 کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی
 وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
 کہ دشمنی میں بھی شدت اسی لگاؤ کی تھی
 مگر یہ درد طلب بھی سراب ہی نکلا
 وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی
 اکیلے پار اتر کر یہ ناخدا نے کہا
 مسافرو یہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی
 چراغ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
 ہوا بھی تیز تھی منزل بھی چل چلاؤ کی تھی
 میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فراز
 میں جانتا تھا یہی راہ اک بچاؤ کی تھی
 جسم شعلہ ہے جبھی جامن سادہ پہنا
 میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا
 سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
 زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا
 خوابشیں یوں ہی برہنہ ہوں تو جل بجھتی ہیں
 اپنی چاہت کو کبھی کوئی ارادہ پہنا
 یار خوش ہیں کہ انہیں جامن احرام ملا
 لوگ بنستے ہیں کہ قامت سے زیادہ پہنا
 یار پیماں شکن آئے اگر اب کے تو اسے
 کوئی زنجیر وفا اے شب وعدہ پہنا
 غیرت عشق تو مانع تھی مگر میں نے فراز
 دوست کا طوق سر محفل اعدا پہنا
 کسی جانب سے بھی پرچم نہ لہو کا نکلا
 اب کے موسم میں بھی عالم وہی ہو کا نکلا
 دست قاتل سے کچھ امید شفا تھی لیکن
 نوک خنجر سے بھی کانٹا نہ گلو کا نکلا
 عشق الزام لگاتا تھا بوس پر کیا کیا
 یہ منافق بھی ترے وصل کا بھوکا نکلا

جی نہیں چاہتا مے خانے کو جائیں جب سے
 شیخ بھی بزم نشیں اہل سب کو نکلا
 دل کو ہم چھوڑ کے دنیا کی طرف آئے تھے
 یہ شبستان بھی اسی غالبہ مو کا نکلا
 ہم عبث سوزن و رشتہ لیے گلیوں میں پھرے
 کسی دل میں نہ کوئی کام رفو کا نکلا
 یار بے فیض سے کیوں ہم کو توقع تھی فراز
 جو نہ اپنا نہ ہمارا نہ عدو کا نکلا
 منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
 مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں
 کوئی قاصد ہو کہ ناصح کوئی عاشق کہ عدو
 سب کی اس شوخ سے وابستگیاں ایک سی ہیں
 دشت مجنوں نہ سہی تیشہ فرہاد سہی
 سفر عشق میں واماندگیاں ایک سی ہیں
 یہ الگ بات کہ احساس جدا ہوں ورنہ
 راحتیں ایک سی افسردگیاں ایک سی ہیں
 صوفی و رند کے مسلک میں سہی لاکھ تضاد
 مستیاں ایک سی وارفتگیاں ایک سی ہیں
 وصل ہو بجر ہو قربت ہو کہ دوری ہو فراز
 ساری کیفیتیں سب تشنگیاں ایک سی ہیں
 قرب جانان کا نہ مے خانے کا موسم آیا
 پھر سے بے صرفہ اجڑ جانے کا موسم آیا
 کنج غربت میں کبھی گوشہ زنداں میں تھے ہم
 جان جاں جب بھی ترے آنے کا موسم آیا
 اب لہو رونے کی خواہش نہ لہو ہونے کی
 دل زندہ ترے مر جانے کا موسم آیا
 کوچہ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
 شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا
 کوئی زنجیر کوئی حرف خرد لیے آیا
 فصل گل اُنی کہ دیوانے کا موسم آیا
 سیل خوں شہر کی گلیوں میں در آیا بے فراز
 اور تو خوش ہے کہ گھر جانے کا موسم آیا
 سکوت شام خزاں بے قریب آ جاؤ
 بڑا اداس سماں بے قریب آ جاؤ
 نہ تم کو خود ہم بھروسہ نہ ہم کو زعم وفا
 نہ اعتبار جہاں بے قریب آ جاؤ
 رہ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
 ہجوم ہم سفران بے قریب آ جاؤ
 جو دشت عشق میں بچھڑے وہ عمر بھر نہ ملے
 یہاں دھواں ہی دھواں بے قریب آ جاؤ
 یہ اندھیاں ہیں تو شہر وفا کی خیر نہیں
 زمانہ خاک فشاں بے قریب آ جاؤ
 فقیہ شہر کی مجلس نہیں کہ دور رہو
 یہ بزم پیر مغاں بے قریب آ جاؤ
 فراز دور کے سورج غروب سمجھے گئے
 یہ دور کم نظراں بے قریب آ جاؤ
 نوحہ گروں میں دیدہ تر بھی اسی کا تھا
 مجھ پر یہ ظلم بار دگر بھی اسی کا تھا
 دیکھا مجھے تو ترک تعلق کے باوجود
 وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اسی کا تھا

آنکھیں کشاد و بست سے بدنام ہو گئیں
 سورج اسی کا خواب سحر بھی اسی کا تھا
 خنجر در آستین ہی ملا جب کبھی ملا
 وہ تیغ کھینچتا تو یہ سر بھی اسی کا تھا
 نشتر چبھے ہوئے تھے رگ جاں کے آس پاس
 وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اسی کا تھا
 محفل میں کل فراز ہی شاید تھا لب کشا
 مقتل میں آج کاسہ سر بھی اسی کا تھا
 رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے
 آپ آئے بھی مگر رونے کے عادی روئے
 ان کے آ جانے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو
 ان کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے
 ہائے پابندی آداب تری محفل کی
 کہ سر راہ گزر رونے کے عادی روئے
 ایک تقریب تبسم تھی بہاراں لیکن
 پھر بھی آنکھیں ہوئیں تر رونے کے عادی روئے
 درد مندوں کو کہیں بھی تو قرار آ نہ سکا
 کوئی صحرا ہو کہ گھر رونے کے عادی روئے
 لے فراز ایسے میں برسات کٹے گی کیوں کر
 گر یوں ہی شام و سحر رونے کے عادی روئے
 نہ سہم سکا جب مسافتوں کے عذاب سارے
 تو کر گئے کوچ میری آنکھوں سے خواب سارے
 بیاض دل پر غزل کی صورت رقم کیے ہیں
 ترے کرم بھی ترے ستم بھی حساب سارے
 بہار آئی ہے تم بھی آؤ ادھر سے گزرو
 کہ دیکھنا چاہتے ہیں تم کو گلاب سارے
 یہ سانحہ ہے کہ واعظوں سے الجھ پڑے ہم
 یہ واقعہ ہے کہ پی رہے تھے شراب سارے
 بھلا ہوا ہم گناہ گاروں نے ضد نہیں کی
 سمیٹ کر لے گیا ہے ناصح ثواب سارے
 فراز کس نے مرے مقدر میں لکھ دیے ہیں
 بس ایک دریا کی دوستی میں سراب سارے
 وفا کے باب میں الزام عاشقی نہ لیا
 کہ تیری بات کی اور تیرا نام بھی نہ لیا
 خوشا وہ لوگ کہ محروم التفات رہے
 ترے کرم کو ہم انداز سادگی نہ لیا
 تمہارے باد کئی باتھ دل کی سمت بڑھے
 بزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا
 تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
 کسی نے سنگ اٹھایا کسی نے مینا لیا
 فراز ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
 کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا
 ترا قرب تھا کہ فراق تھا وہی تیری جلوہ گری رہی
 کہ جو روشنی ترے جسم کی تھی مرے بدن میں بھری رہی
 ترے شہر میں میں چلا تھا جب تو کوئی بھی ساتھ نہ تھا مرے
 تو میں کس سے محو کلام تھا تو یہ کس کی ہم سفری رہی
 مجھے اپنے آپ پر مان تھا کہ نہ جب تلک ترا دھیان تھا
 تو مثال تھی مری آگہی تو کمال ہے خبری رہی
 مرے آشنا بھی عجیب تھے نہ رفیق تھے نہ رقیب تھے
 مجھے جاں سے درد عزیز تھا انہیں فکر چارہ گری رہی

میں یہ جانتا تھا مرا ہنر ہے شکست و ریخت سے معتبر
 جہاں لوگ سنگ بدست تھے وہیں میری شیشہ گری رہی
 جہاں ناصحوں کا ہجوم تھا وہیں عاشقوں کی بھی دھوم تھی
 جہاں بخیہ گر تھے گلی گلی وہیں رسم جامہ دری رہی
 ترے پاس آ کے بھی جانے کیوں مری تشنگی میں براس تھا
 ہم مثال چشم غزال جو لب آب جو بھی ڈری رہی
 جو بوس فروش تھے شہر کے سبھی مال بیچ کے جا چکے
 مگر ایک جنس وفا مری سر رہ دھری کی دھری رہی
 مرے ناقدوں نے فراز جب مرا حرف حرف پرکھ لیا
 تو کہا کہ عہد ریا میں بھی جو بات کھری تھی کھری رہی
 یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
 چارہ گر روئیں گے اور غم خوار بن جائیں گے ہم
 ہم سر چاک وفا ہیں اور ترا دست ہنر
 جو بنا دے گا ہمیں اے یار بن جائیں گے ہم
 کیا خبر تھی اے نگار شعر تیرے عشق میں
 دلبران شہر کے دل دار بن جائیں گے ہم
 سخت جاں ہیں پر ہماری استواری پر نہ جا
 ایسے ٹوٹیں گے ترا اقرار بن جائیں گے ہم
 اور کچھ دن بیٹھنے دو کوئے جاناں میں ہمیں
 رفتہ رفتہ سایہ دیوار بن جائیں گے ہم
 اس قدر آساں نہ ہوگی ہر کسی سے دوستی
 آشنائی میں ترا معیار بن جائیں گے ہم
 میر و غالب کیا کہ بن پائے نہیں فیض و فراق
 زعم یہ تھا رومی و عطار بن جائیں گے ہم
 ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے
 کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے
 ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست
 سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے
 میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
 کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے
 فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
 میں ترے شہر سے دور اور تو مرے دھیان میں ہے
 سر دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
 اے نسیم سحری کچھ ترے امکان میں ہے
 دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گائے گائے
 جیسے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے
 خلقت شہر کے ہر ظلم کے با وصف فراز
 ہائے وہ بات کہ اپنے ہی گریبان میں ہے
 ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
 کہ ہے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ
 پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
 لگا ہے توسن بستی کو تازیانہ وہ
 ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا پارا
 ترے بھی رنگ نہیں گردش زمانہ وہ
 اب اپنی خوابشیں کیا کیا اسے رلاتی ہیں
 یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ
 یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
 جو عہد ٹوٹ چکا یاد کیا دلانا وہ
 اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
 نگار تھا نظر آیا نگار خانہ وہ

بجھا دیا ہے تجھے بھی فرازِ دنیا نے
 کہاں گیا ترا ہر وقت مسکرانا وہ
 قامت کو تیرے سرو صنوبر نہیں کہا
 جیسا بھی تو تھا اس سے تو بڑھ کر نہیں کہا
 اس سے ملے تو زعمِ تکلم کے باوجود
 جو سوچ کر گئے وہی اکثر نہیں کہا
 اتنی مرو تیں تو کہاں دشمنوں میں تھیں
 یاروں نے جو کہا مرے منہ پر نہیں کہا
 مجھ سا گناہ گار سر دار کہہ گیا
 واعظ نے جو سخن سر منبر نہیں کہا
 برہم بس اس خطا پہ امیرانِ شہر ہیں
 ان جوہڑوں کو میں نے سمندر نہیں کہا
 یہ لوگ میری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
 میں نے فرازِ خود کو پیمبر نہیں کہا
 بیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
 ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ
 باغیانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
 گل فروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ
 قاتل اس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
 ایک درویش بھی دیکھا اسی دربار کے بیچ
 کچ ادائوں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
 کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ
 تم ہو نا خوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فرازِ
 لوگ رہتے ہیں اسی شہر دل آزار کے بیچ
 نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں
 ہم اپنے بے خبروں کو تلاش کرتے ہیں
 محبتوں کا بھی موسم ہے جب گزر جائے
 سب اپنے اپنے گھروں کو تلاش کرتے ہیں
 سنا ہے کل جنہیں دستارِ افتخار ملی
 وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں
 یہ عشق کیا ہے کہ اظہارِ آرزو کے لیے
 حریفِ نوحہ گروں کو تلاش کرتے ہیں
 یہ ہم جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں قتل گاہوں کو
 دراصل چارہ گروں کو تلاش کرتے ہیں
 رہا ہوئے ہم عجب حال ہے اسیروں کا
 کہ اب وہ اپنے پروں کو تلاش کرتے ہیں
 فرازِ داد کے قابل ہے جستجو ان کی
 جو ہم سے دریدروں کو تلاش کرتے ہیں
 تھا عبث ترکِ تعلق کا ارادہ یوں بھی
 عشقِ زندہ نہیں رہتا ہے زیادہ یوں بھی
 اک تو ان آنکھوں میں نشہ تھا بلا کا اس پر
 ہم کو مرغوب ہے کیفیتِ بادہ یوں بھی
 نامہ ہر اس سے نہ احوالِ ہمارا کہنا
 وہ تنکِ خو ہے بگڑ جائے میادِ یوں بھی
 سو گئے ہم بھی کہ بیکار تھا رستہ نکنا
 اس کو آنا ہی نہیں تھا شبِ وعدہ یوں بھی
 کچھ تو وہ حسنِ پشیمان ہے جفا پر اپنی
 اور کچھ اس کے لیے دل تھا کشادہ یوں بھی
 کوچ کر جاتے ہیں ہم کوئے محبت سے فرازِ
 ان دنوں چاکِ گریباں ہیں زیادہ یوں بھی

سوئے فلک نہ جانب مہتاب دیکھنا
 اس شہر دل نواز کے آداب دیکھنا
 تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
 آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا
 وہ موج خوں اٹھی ہے کہ دیوار و در کہاں
 اب کے فصیل شہر کو غرقاب دیکھنا
 ان صورتوں کو ترسے گی چشم جہاں کہ آج
 کم یاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا
 پھر خون خلق و گردن مینا بچائیو
 پر چل پڑا ہے ذکر مئے ناب دیکھنا
 آباد کوئے چاک گریباں جو پھر ہوا
 دست رقیب و دامن احباب دیکھنا
 ہم لے تو آئے ہیں تجھے اک بے دلی کے ساتھ
 اس انجمن میں لے دل بیتاب دیکھنا
 حد چاہئے فراز وفا میں بھی اور تمہیں
 غم دیکھنا نہ دل کی تب و تاب دیکھنا
 ہر کوئی طرہ پیچاک پہن کر نکلا
 ایک میں پیرہن خاک پہن کر نکلا
 اور پھر سب نے یہ دیکھا کہ اسی مقتل سے
 میرا قاتل مری پوشاک پہن کر نکلا
 ایک بندہ تھا کہ اوڑھے تھا خدائی ساری
 اک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا
 ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
 ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نکلا
 ترکش و دام عبث لے کے چلا بے صیاد
 جو بھی نخچیر بے فتراک پہن کر نکلا
 اس کے قامت سے اسے جان گئے لوگ فراز
 جو لبادہ بھی وہ چالاک پہن کر نکلا
 اس منظر سادہ میں کئی جال بندھے تھے
 جب اس کا گریباں کھلا بال بندھے تھے
 اے زود فراموش کہاں تو بے کہ تجھ سے
 میرے تو شب و روز مہ و سال بندھے تھے
 وہ رشک غزالاں تھا مگر دام میں اس کے
 ہم جیسے کئی صید زبوں حال بندھے تھے
 دیکھے کوئی ناصح کی جو حالت ہے کہ ہم تو
 اس بت کی محبت میں بہر حال بندھے تھے
 صیاد کو پھر بھی مری پرواز کا ڈر تھا
 میں گرچہ قفس میں تھا پر و بال بندھے تھے
 یوں دل تہہ و بالا کبھی ہوتے نہیں دیکھے
 اک شخص کے پاؤں سے تو بھونچال بندھے تھے
 وقت آیا تو میں مقتل جاں میں تھا اکیلا
 یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندھے تھے
 اک بوند تھی لہو کی سر دار تو گری
 یہ بھی بہت بے خوف کی دیوار تو گری
 کچھ مغیچوں کی جرات رندانہ کے نثار
 اب کے خطیب شہر کی دستار تو گری
 کچھ سر بھی کٹ گرے ہیں پہ کہرام تو مچا
 یوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار بھی گری
 شگفت گل کی صدا میں رنگ چمن میں آؤ
 کوئی بھی رت ہو بہار کے پیرہن میں آؤ

کوئی سفر ہو تمہیں کو منزل سمجھ کے جاؤں
 کوئی مسافت ہو تم مری ہی لگن میں آؤ
 کبھی تو ایسا بھی ہو کہ لوگوں کی بات سن کر
 مری طرف تم رقابتوں کی جلن میں آؤ
 وہ جس غرور اور ناز سے تم چلے گئے تھے
 کبھی اسی تمکنت اسی بانگین میں آؤ
 یہ کیوں ہمیشہ مری طلب ہی تمہیں صدا دے
 کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ
 بزار مفلس سہی مگر ہم سخی ہلا کے
 کبھی تو تم اہل درد کی انجمن میں آؤ
 ہم اہل دل ہیں ہماری اقلیم حرف کی ہے
 کبھی تو جان سخن دیار سخن میں آؤ
 کبھی کبھی دوریوں سے کوئی پکارتا ہے
 فراز جانی فراز پیارے وطن میں آؤ
 تھا کوئی یا نہیں تھا جو کچھ تھا
 دل کے اندر کہیں تھا جو کچھ تھا
 تو بھی اپنے سے خوش گماں تھا بہت
 میں بھی اپنے تئیں تھا جو کچھ تھا
 شہر خواباں میں وہ وفا دشمن
 خوب صورت تریں تھا جو کچھ تھا
 درد مے تھی کہ تلخی بستی
 جام میں تہہ نشیں تھا جو کچھ تھا
 چھوڑ آئے عبث در جاناں
 یار سب کچھ وہیں تھا جو کچھ تھا
 عشق اکسیر تھا دلوں کے لئے
 زہر تھا انگلیں تھا جو کچھ تھا
 ہوش آیا تو اب کھلا ہے فراز
 میں تو کچھ بھی نہیں تھا جو کچھ تھا
 تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ
 پھول روئے تو اسے خندہ شاداب سمجھ
 کہیں آ جائے میسر تو مقدر تیرا
 ورنہ آسودگی دہر کو نایاب سمجھ
 حسرت گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
 خشک آنکھوں کو میری چشمہ ہے اب سمجھ
 موج دریا ہی کو آوارہ سد شوق نہ کہہ
 ریگ ساحل کو بھی لب تشنہ سیلاب سمجھ
 یہ بھی وا ہے کسی مانوس کرن کی خاطر
 روزن در کو بھی اک دیدہ ہے خواب سمجھ
 اب کسے ساحل امید سے تکتا ہے فراز
 وہ جو اک کشتی دل تھی اسے غرقاب سمجھ
 نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
 کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے
 ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے جانتے ہیں
 دام دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے
 میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک
 مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے
 لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
 مستقل بحر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
 رہروان رہ الفت کا مقدر معلوم
 ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ پر یہ حقیقت ہے فراز
تری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے
Poet: Ahmad Faraz